Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies
Vol. 3, No. 04 (November 2024), pp. 89-101
ISSN (Print): 2958-5112
ISSN (Online): 2958-5120
http://www.ipics.rmrpublishers.org
http://journals.rmrpublishers.org/insights-of-pakistan-iran-and-the-caucasus-studies/

Iqbal's Thought: A Brief Overview and Its Impact on Pakistan

Muhammad Azam (Corresponding Author)
Assistant Professor at the Department of Persian Language, Government Graduate College Asghar Mall, Rawalpindi
Email: muhammadazampersian@gmail.com

Publication History:
Received: September 01, 2024
Revised: September 30, 2024
Accepted: October 14, 2024
Published Online: November 01, 2024

Keywords:
Iqbal's Philosophy,
Nationalism,
Pakistan's Emancipation,
Eastern and Western Thought,
Selfhood and Unity,
Cultural Influence,

Research related to Academic Areas:
Pakistan Studies & Urdu Literature

Acknowledgment:
This paper is a sole academic venture of the author.

Ethical Consideration:
This study has no aim to hurt any ideological or social segment but is purely based on academic purposes.

DOI:
10.5281/zenodo.14009304

Abstract
Alluding to the development of human personality as a seed that flourishes through education and environment, this study examines Allama Iqbal’s intellectual growth and how it shaped his influence in Pakistan. Influenced by familial roots, early mentors like Maulana Mir Hassan, and the philosophical guidance of Professor Thomas Arnold, Iqbal’s unique synthesis of Eastern spirituality and Western intellectualism emerged. His poetry reflects not only his philosophical introspection but also his engagement with nationalism, capturing an intense longing for Pakistan's emancipation and cultural pride. This article discusses the phases of Iqbal’s thought, from romantic reflections on nature and mystical philosophy to his evolving nationalistic fervor, particularly during his Lahore college years. His early poetic works reveal both his patriotism and a deep-rooted desire for unity, with timeless messages of selfhood, societal ethics, and resistance against colonial rule, all of which continue to inspire Pakistan’s ideological and cultural discourse.

Copyright © 2024 IPICS Journal as an academic research-oriented non-profit initiative of Rehmat and Maryam Researches (SMC-Pvt) Limited, working in Islamabad, Rawalpindi and Lodhran under the Security and Exchange Commission of Pakistan (SECP), and approved by the Higher Education Commission Pakistan for Y Category during October 2024 to December 2025. This is an open-access article. However, its distribution and/or reproduction in any medium is subject to the proper citation of the original work.

فکرِ اقبال: ایک مختصر جائزہ

فرد کی شخصیت ایک بیج کی مانند اگتی، پھولتی اور پھلتی ہے۔ خانگی اور معاشرتی ماحول وہ زمین ہے جس کا رس چوس کر شخصیت کا بنیادی جوہر بیج کے اکھوے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ تعلیم و تربیت کی آب و ہوا اور عصری حالات و تحریکات کی کھلی فضا میں شخصیت کا پودا پروان چڑھتا ہے اور برگ و بار لاتا ہے۔ جس طرح بیج میں پورے درخت کا وجود جوہری صورت میں مرتکز ہوتا ہے اسی طرح ہر فرد کی خلقت میں کچھ بنیادی عناصر ہوتے ہیں جن میں سے بعض اسے اپنے اجداد سے وراثت میں ملتے ہیں۔ لہذا جب ہم کسی شاعر، ادیب، مفکر یا فن کار کے ذہنی اور فکری پہلوؤں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ماحول، تعلیم و تربیت کے مختلف مراحل اور دیگر خارجی عوامل و محرکات سے پہلے اس کے نسلی اور خاندانی اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔(1)

اقبال شاعر بھی ہے اور مفکر بھی، وہ حکیم بھی ہے اور کلیم بھی، وہ خودی کا پیغامبر بھی ہے اور بے خودی کا رمز شناس بھی، وہ توقیر آدم کا مبلغ بھی ہے اور تحقیر انساں سے دردمند بھی۔ اس کے کلام میں فکر و ذکر ہم آغوش ہیں اور خبر و نظر آئینہ یک دیگر ایسے ہمہ گیر دل و دماغ کے مالک اور صاحب عرفان و وجدان کے افکار اور تاثرات کا تجزیہ اور اس پر تنقید کوئی آسان کام نہیں۔(2)

اقبال کی فکر کے زاویے اپنے اسلاف سے مختلف ضرور تھے لیکن تفکر ان کی شخصیت کا ایسا نمایاں عنصر تھا جو کہ ان کے کلام ان کی تحریروں، تقاریر اور عام گفتگو میں ہر جگہ نمایاں ہے۔(3)

پہلا دور:(آغاز سے 1905ء تک)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے دماغ کی پرورش تو طویل سلسلہ تعلیم میں ہوتی رہی لیکن روح کی غذا ان کو شروع ہی سے جسمانی رزق کے ساتھ باپ سے ملتی رہی۔ والدہ ماجدہ کی اچھی تربیت کا اندازہ اس مرثیے سے ہو سکتا ہے جس میں بڑھاپے کے قریب پہنچے ہوئے اقبال نے کس سوز و گداز سے ماں کو یاد کیا ہے اور اپنے جوہر کمال کو اس کا مرہون منت قرار دیا ہے۔ اقبال آخری عمر میں فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنا نظریہ حیات فلسفیانہ جستجو سے حاصل نہیں کیا۔ زندگی کے متعلق ایک مخصوص زاویہ نگاہ ورثے میں مل گیا تھا۔ بعد میں، میں نے عقل و استدلال کو اسی کے ثبوت میں صرف کیا۔ انسان کے سب سے پہلے اساتذہ اس کے ماں باپ ہی ہوتے ہیں اور ماں سے شعوری اور غیر شعوری طور پر جو کچھ حاصل کیا جاتا ہے اس کے نقوش نہایت گہرے اور انمٹ ہوتے ہیں۔ والدین کے ساتھ ان کو مولانا میر حسن جیسا علمی، ادبی اور اخلاقی استاد ملا اور استاد کی سیرت، بصیرت کے خط و خال بھی اقبال کی فطرت کے جزو بن گئے۔ شعر فہمی اور سخن سنجی میں یقیناً مولانا میر حسن سے ان کو غیر معمولی فیض حاصل ہوا۔(4)

گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال کی چار سالہ زندگی کا سب سے اہم واقعہ پروفیسر آرنلڈ جیسے شفیق اور کردار ساز استاد کی شاگردی کا شرف ہے۔ جس کا آغاز اس وقت ہوا جب 11 فروری 1898ء کو انہوں نے گورنمنٹ کالج میں صدر شعبہ فلسفہ کا جائزہ لیا۔ یوں تو بظاہر ایم۔اے فلسفہ کی جماعت میں آرنلڈ کی باقاعدہ شاگردی کی مدت صرف ایک سال ہے لیکن ایم۔اے کے بعد بھی علم و تحقیق کے میدان میں لاہور سے لندن تک پروفیسر آرنلڈ کی پرخلوص رفاقت اور رہنمائی اقبال پر سایہ فگن رہی۔ اقبال اپنے فاضل استاد کی شخصیت سے غائبانہ طور پر پہلے ہی واقف ہوں گے کیونکہ پروفیسر آرنلڈ نہ صرف علی گڑھ کالج کے استاد تھے بلکہ ایک انصاف پسند مستشرق اور مسلم دوست عالم و محقق کی حیثیت سے علی گڑھ تحریک کے معاون اور سر سید کے حلقہ خاص کے رکن بھی تھے۔(5)

یہ اقبال کی خوش نصیبی تھی کہ جس طرح تعلیم کے ابتدائی مراحل میں انھیں شاہ جی (مولوی میر حسن) جیسا کردار ساز استاد ملا جس نے انھیں مشرقی ادبیات کے صحیح ذوق اور اسلامی علوم و حکمت کی روح سے آشنا کیا اسی طرح آخری دور میں آرنلڈ جیسا مجمع البحرین استاد بھی میسر آ گیا۔ جس نے ان کے اندر تحقیق و تنقید کا مذاق پیدا کیا اور نہ صرف مغربی ادب و فلسفہ کے مطالعہ میں ان کی راہنمائی کی بلکہ ان کی شخصیت میں مشرقیت اور مغربیت کے امتزاج کی طرح ڈال دی۔(6)

بی۔اے کی تعلیم کیلئے اقبال گورنمنٹ کالج میں جب آئے تو لاہور کی صحبتوں میں ان کی شاعری کا نخل شگوفہ، ثمر پیدا کرنے لگا۔ ان کی شاعری کا چرچا ہم جماعتوں سے نکل کر خاص احباب کے حلقوں میں ہونے لگا۔ لاہور کے ایک مشاعرے میں اقبال نے یہ رباعی پڑھی:

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر
چشم اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر (7)

اِس دور میں بھی اُس اقبال کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جس کا آفتاب کمال بہت جلد افق سے ابھرنے والا تھا۔ اس دور کی شاعری کو فکرِ اقبال کی صبح کاذب کہنا چاہیے جس کی روشنی طلوعِ آفتاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔(8)

اس دور میں بھی ان کے ہاں حکیمانہ اشعار ملتے ہیں:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انسان
کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے
وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے

Copyright © 2024 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے (9)

ان چند غزلیات میں جو بانگِ درا میں درج ہیں، ارتقائے فکر و فن کی رفتار خاصی تیز معلوم ہوتی ہے۔ بعض غزلوں میں فکر کی گہرائی اور فن کی پختگی نمایاں ہے۔ ان میں کچھ عشقِ مجازی کی آمیزش ہے۔ کچھ روایتی متصوفانہ مضامین ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ ملے جلے حکیمانہ اشعار بھی ہیں۔ اندازِ بیان میں انوکھا پن ہے جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ شاعر روایتی تغزل سے رفتہ رفتہ الگ ہو رہا ہے۔

کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیونکر ہوا؟
اور اسیر حلقہ دام ہوا، کیونکر ہوا؟
جائے حیرت ہے برا سارے زمانے کا ہوں میں؟
مجھ کو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا؟ (10)

اس دور کی شاعری میں وطن پرستی کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اقبال ہندوستان کی غلامی پر مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔ نظم ہمالہ میں وطن کا شاندار ماضی اور اُس کی تہذیبی روایات کا ذکر ہے۔ صدائے درد اسی موضوع پر لکھی گئی:

وطن کی فکر کر ناداں ، مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں (11)

ترانہ ہندی میں ہندوستانی قومیت کا موثر اظہار ہے۔ اور نیا شوالہ میں وطنیت کا خیال موجزن ہے۔

خاک وطن کا مجکو ہر ذرہ دیوتا ہے

اور

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھادیں
بچھڑوں کو ملادیں ، نقشِ دوئی مٹادیں
سونی پڑی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنادیں (12)

اقبال کی نظم ہمالہ میں فطرت کا جو رجحان نظر آتا ہے وہ اس دور کی اور نظموں میں واضح رخ اختیار کر گیا ہے۔ مثلاً گلِ رنگین، ابر کہسار، آفتابِ صبح، ماہ نو، جگنو اور ایک آرزو وغیرہ۔ کائنات کا حسن اقبال کو متاثر کرتا ہے لیکن وہ اس قدر مسحور نہیں کرتا کہ اقبال پر خود فراموشی کی حالت طاری ہو جائے بلکہ یہاں پر اقبال کی فلسفیانہ طبیعت کا جو اصل جوہر نمایاں ہوتا ہے وہ قدرت کے رازہائے سربستہ کی گرہ کشائی ہے۔ ایک آرزو میں زندگی سے گریز کی خواہش نمایاں ہے۔

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں، دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو (13)

توحیدِ مطلق کا نظریہ

توحید مطلق کا نظریہ، از عبد الکریم الجیلی: یہ اقبال کا انگریزی میں پہلا ریسرچ پیپر تھا۔ اس مقالے میں اقبال نے الجیلی کے انسان کامل کے نظریے پر بحث کی ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کے فکری اور ذہنی ارتقا میں اس مقالے کی خاص اہمیت ہے۔

علم الاقتصاد

Copyright © 2024 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

یہ 1904 میں شائع ہوئی۔ یہ اقبال کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کتاب کا ایک باب "آبادی" ماہنامہ "مخزن" شمارہ اپریل 1904 میں شائع ہوا۔ شیخ عبد القادر نے اداریے میں یہ تبصرہ کیا:

"شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے نے حال ہی میں ایک کتاب پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ایما پر علم الاقتصاد کے نام سے لکھی ہے جس کا انگریزی نام "پولیٹیکل اکانومی" ہے اور جسے "علم سیاست مدن" کہتے ہیں۔ بلامبالغہ اس فن میں ایسی جامع اور عام فہم کتاب اردو زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔" (14)

دوسرا دور (1805ء تا 1908ء)

1905ء میں اقبال اعلیٰ تعلیم کیلئے انگلستان تشریف لے گئے۔ تین سال تک وہاں قیام کیا۔ قیام یورپ کے دوران اقبال کو حکمتِ فرنگ سے گہرا تعلق پیدا کرنے اور اس کی تہذیب و تمدن کو براہِ راست مشاہدہ کرنے سے طرح طرح کے فوائد پہنچے۔ اقبال کی نظر آغاز ہی سے محققانہ تھی۔ اس لیے اسکی زندگی میں مغرب کی کورانہ تقلید کا کوئی شائبہ پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ اقبال نے یورپ کے سطحی جلووں کو بھی دیکھا لیکن اس کے ساتھ وہ اس کے باطن پر بھی گہری نظر ڈالتا گیا۔ اس نے فرنگ میں علم و ہنر کے کمالات اور انسانی زندگی کی بہبود کے لئے ان کے کمالات کو بھی دیکھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس سے بھی آگاہ ہو گیا کہ اس کی تعمیر میں خرابی کی صورت بھی مضمر ہے:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا (15)

اس دور کی شاعری کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کا رخ تبدیل ہو گیا۔ اسی زمانے کی چند نظمیں ایسی ہیں جن میں اقبال کی آئندہ پیغمبرانہ شاعری کے خط و خال ابھرتے نظر آتے ہیں۔

1905ء سے 1908ء تک جو نظمیں اور غزلیں کہی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال وطنیت کے مسئلے پر اور اسلامی نقطہ نگاہ سے غور کرنے کی طرف مائل ہو رہے تھے اور انہوں نے سنجیدگی سے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ شاید ہندوستان میں جو دو بڑی قومیں آباد ہیں، ان کا مذہبی اور تمدنی اختلاف آخر ایسے افتراق پر منتج ہو گا جس میں وطنیت کے اسلامی تصور کو مرکزیت حاصل ہو گی۔ (16)

پیر مغاں افرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے
تجھ کو خبر نہیں ہے کیا؟ بزم سخن بدل گئی
اب نہ خدا کے واسطے ان کو مے حجاز دے (17)

اسی طرح کوشش ناتمام، طلبہ علی گڑھ کے نام اور عبد القادر کے نام اس لحاظ سے عمدہ مثالیں ہیں۔

یہ امتیاز بھی اسی دور کو حاصل ہے کہ اقبال کا تصورِ وطنیت، ملت کے تصور میں بدلتا نظر آتا ہے:

وجود افراد کا ہے مجازی ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہِ حجاز ہو جا (18)

اس دور کی آخری نظم صقلیہ (جزیرہ سسلی) میں تہذیب حجازی کی شان و شوکت اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی تباہی اور شکست انہیں بہت متاثر کرتی ہے۔ اس نظم کو فکر اقبال کے حوالے سے انقلابی شاعری کی بنیاد کہا جاتا ہے۔

قیام یورپ کا سب سے بڑا کارنامہ اقبال کی کتاب ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا ہے انگریزی میں اس کا نام (Development of Metaphysics in Persia) ہے۔ "فلسفۂ عجم" کے نام سے میر حسن الدین نے 1927ء میں اس کا ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں اقبال نے ایرانی تفکر کے منطقی استدلال کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے اور اس کو فلسفہ جدید کی زبان میں پیش کیا ہے ۔ دوسرا اس میں اقبال نے تصوف کے موضوع پر سائنسی طریقے سے بحث کی ہے۔

Copyright © 2024 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

تیسرا دور(1908ء تادمِ مرگ)

یورپ کی مادہ پرست تہذیب اور لادین سیاست کے محرکات و نتائج کے گہرے مطالعہ نے اقبال کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ ظاہر ہے اس ذہنی انقلاب کے بعد اقبال کے جذبات و خیالات کا رخ وطنیت سے ملت یا قومیت کی طرف مڑ گیا۔(19)

اقبال نے اس دور میں مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات اور ان کی صداقت و عظمت سے آگاہ کر کے ان کے احساس کمتری کو مٹانے اور ان کے احساس برتری کو ابھارنے کی کوشش کی۔ وہ فکری انقلاب جو قیامِ یورپ کے بعد رونما ہوا، اس کا اظہار اس عرصے کی شاعری میں ملتا ہے۔ اقبال کی شاعری کے بڑے موضوعات مثلاً تصوف، عشق، خودی، بے خودی، تہذیب مغرب، مردِ مومن اور عشقِ رسول ﷺ وغیرہ اسی دور سے متعلق ہیں۔

تصورِ عشق

اقبال نے عشق کے تصور کا پیراہنِ حریر اتنے رنگا رنگ تاروں سے تیار کیا ہے کہ اس کلمے کی کوئی اصطلاحی یا جامع و مانع تعریف کرنا ناممکن ہے۔ سچ یہ ہے کہ جس طرح مولانا روم نے شمس کی ذات کو عشق کی تمام کیفیات کے اظہار کے لیے انتخاب کر لیا تھا۔ اسی طرح اقبال نے خود عشق کے تعقل کو محبوبیت کا رتبہ بخشا ہے۔(20)

مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ شروع میں اقبال کے انسانی عشق کا تصور خالص مجازی تھا۔ اس میں کسی اور جذبے کی آمیزش نہیں تھی۔ یورپ سے واپسی پر اس کا مجازی عشق اجتماعی اور اخلاقی مقاصد کا عشق بن گیا۔ دونوں حالتوں میں اس میں جذبے سے زیادہ فکر و تعقل نمایاں ہے۔(21)

اقبال کا تصورِ عشق اپنے پہلو میں فلسفہ خودی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے ہاں عشق، جذبہ ارتقا، ذوقِ تخلیق، ذوقِ تسخیر اور استحکام خودی ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں۔ (22)

ہے ابد کے نسخہ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی، زندہ جاوید عشق (23)

ہے مگر نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشقِ دم جبریل، عشق دلِ مصطفیٰ ﷺ
عشق خدا کا رسول ﷺ، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گُل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام(24)

مردِ مومن:

انسان کامل یا مردِ مومن اقبال کا من پسند موضوع ہے۔ فکری ارتقاء کی اس منزل میں یہ اپنے نقطہ عروج پر نظر آتا ہے۔ اقبال جب مردِ مومن کہتے ہیں تو ایمان کا سب سے بلند درجہ ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے یعنی مقام دعوت و عزیمت اور یہ مقام ان ہی کو حاصل ہوتا ہے جنھیں رسولِ پاک ﷺ کی ذات سے بے پناہ عقیدت ہوتی ہے۔

Copyright © 2024 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے (25)

تصورِ ملت

اس دور میں وطنیت کا تصور مکمل طور پر قومیت کا لبادہ اوڑھ چکا ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ (26)

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر (27)

تہذیبِ مغرب

مغرب کی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ جس ذہنی تحریک کا آغاز روسو اور لوتھر کی ذات سے ہوا اُس نے مسیحی دنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تقسیم کر دیا جس سے اہلِ مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر مطمع نظر سے ہٹ کر، جو تمام نوعِ انسان سے متعلق تھا، اقوام و ملل کے تنگ حدود میں الجھ گئیں۔ (28)

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری (29)

اقبال نے 1905ء سے 1908ء کا عرصہ یورپ میں گزارا اور مغرب کی تہذیب کو بڑے قریب سے دیکھا۔ مغربی اقوام کی مادہ پرستی دیکھ کر اقبال ان کے مستقبل سے مایوس ہو گئے اور اقبال کو یقین ہو گیا کہ تہذیبِ حجازی کی طرف عود کرنے سے ہی عالم کی کامیابی ہے۔ اقبال نے مغرب کی سیاست کی چالوں کو آشکار کیا اور سیاستِ حجازی کی اہمیت کو اور خلافت کو اجاگر کیا۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے (30)

اسرارِ خودی 1915ء

Copyright © 2024 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

مثنوی اسرارِ خودی پہلی مرتبہ اپریل 1915ء میں شائع ہوئی۔ علامہ نے اس کی اشاعت سے قبل اپنے چند دوستوں کو خطوط بھی لکھے تھے کہ اس مثنوی کے لیے کوئی موزوں نام تجویز کریں۔ چناچہ اس سلسلے میں انھوں نے خواجہ حسن نظامی صاحب کو بھی خطوط لکھے تھے کہ یہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت واستحکام پر بحث کی گئی ہے، تقریباً تیار ہے اور پریس جانے کو ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمایئے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کے نام "اسرارِ حیات" اور "پیامِ سروش" تجویز کیے ہیں۔

بہر حال مختلف ناموں میں سے "اسرارِ خودی" علامہ کو پسند آیا اور اس میں یہ خوبی بھی ہے کہ یہ ترکیب مثنوی کے پہلے شعر میں مستعمل ہے:

پیکرِ ہستی ز اسرارِ خودی است

ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

جب اسرارِ خودی شائع ہوئی تو بعض صوفی اور پیر جو روایاتِ باطلہ کی پابندی میں گرفتار تھے اور شریعتِ حقہ سے ناواقف تھے، اقبال کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ورغلایا کہ اقبال کو دار پر کھینچ دو کیونکہ یہ لوگوں کو مغربی مادیت کی تعلیم دے رہا ہے۔ جب کہ اقبال ان لوگوں میں سے ہے جو ایک پیغام اور ایک مقصد لے کر کبھی کبھی دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مشرق کی روح ایک ترجمان کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اس کی شاعری نے اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ اس نے اپنے عصا سے چٹان پر ضرب لگائی ہے جس سے وہ چشمہ پھوٹا ہے جو بنی اسرائیل کے چشموں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔(31)

اقبال کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو خودی یا شخصیت انسان کی عظیم ترین متاع ہے۔ انسان میں زندہ رہنے کا احساس تبھی قائم رہتا ہے کہ اس کے جذبات میں تناؤ کی حالت مسلسل برقرار رکھی جائے تاکہ شدتِ جذبات کو نہ تو ضعف پہنچے اور نہ اس میں کمی واقع ہونے دی جائے۔ پس اقبال کے ہاں جذبات کے تناؤ یا مسلسل چاہتے رہنے کا نام ہی زندگی ہے۔(32)

پیکر ہستی ز اسرار خودی است

ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است

خویشتن را چون خودی بیدار کرد

آشکارا عالم پندار کرد

نقطہ نوری کہ نامِ او خودی است

زیرِ خاکِ ما شرار زندگی است

از محبت می شود پایندہ تر

زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر(33)

رموزِ بے خودی 1918ء

تصور بے خودی دراصل اسرار خودی کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں بتاتے ہیں کہ افراد کے لئے لازم ہے کہ وہ ایک خاص حد تک انا کی انفرادی حیثیت کو برقرار رکھیں اور اس کے بعد ملت کی فلاح و بہبود پر انفرایت کو قربان کر دیں۔

مثنوی رموز بے خودی 1918ء میں پہلی دفعہ شائع ہوئی تھی۔ اس میں علامہ نے فرد اور ملت کے باہمی ربط کی جس منطقی انداز میں صراحت کی، اس سے فلسفہ خودی اور "بے خودی" کے درمیان مکمل ہم آہنگی آشکار ہو گئی۔ جس طرح علامہ نے خودی کے لفظ کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا بعینہ "بے خودی" کو بھی بالکل نئے معنی پہنائے ہیں۔ اگر خودی سے اقبال کی مراد اثبات و تعیین ذات ہے تو بے خودی سے مراد فرد کا جماعت میں انضمام ہے۔(34)

اس مثنوی کے مباحث عالیہ پر مجموعی نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ علامہ نے اس میں اسلام کے دستور العمل کی وضاحت کر دی ہے۔ یعنی اس کے مطالعہ سے ہر شخص اسلام کے بنیادی افکار، اصول اور ارکان سے آگاہ ہو سکتا ہے اور جو نقش اس کے مطالعہ سے دماغ میں قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دینِ اسلام بلاشبہ ایک مخصوص ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا نام ہے، اس لیے وہ دنیا کے کسی نظام حیات یا دستور العمل سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اسلامی دستور العمل ایک عضو کل کا حکم رکھتا ہے یعنی یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس کے قانون کی

Copyright © 2024 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

خلاف ورزی کر کے ملتِ اسلامیہ میں شامل رہ سکے۔ اس دستور العمل کے اصول اس طرح باہم مربوط ہیں کہ اگر ایک اصل کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ جس طرح مشین کا ایک پرزہ اگر اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو مشین بیکار ہو جائے گی۔

فرد را ربط جماعت رحمت است
جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش
رونق ہنگامہ احرار باش
حرزِ جان کن گفتہ خیر البشر ﷺ(36)
ہست شیطان از جماعت دور تر
فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند
سلک و گوہر، کہکشان و اختر اند
فرد میگیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرہ وسعت طلب قلزم شود(36)

پیامِ مشرق1933ء

اس کی تصنیف کی وجہ اقبال خود بتاتے ہیں کہ جرمن شاعر گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب میں لکھی گئی۔ اس میں اقبال بتاتے ہیں کہ مغرب کی مادیت جوش اور زندگی سے معرا ہے۔ پیامِ مشرق میں اقبال نے احساس، جوش، حرکت و عمل کو پیدا کرنے پر زور دیا ہے۔

پیامِ مشرق کی اہمیت

"پیامِ مشرق" علامہ اقبال کے فارسی کلام کا تیسرا مجموعہ ہے جو 1923ء مین چھپا۔ اس سے پہلے ان کے فارسی کلام کے دو مجموعے "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کے عنوانات میں چھپ چکے تھے۔

"پیامِ مشرق" کو اس اعتبار سے خصوصیت حاصل ہے کہ اقبال نے یہ جرمنی کے معروف اور بلند پایہ شاعر گوئٹے کے "مغربی دیوان" کے جواب میں لکھی اور گوئٹے کو اپنی طرح "دانائے ضمیرِ کائنات" گردانا ہے۔ گوئٹے کی بے چین روح مغرب کی ہنگامہ پرور زندگی سے بے زار تھی۔ وہ مشرق کی پُر سکون فضا کا متمنی تھا۔ فارسی شاعر حافظ شیرازی کے کلام کے سحر میں گرفتار تھا۔ دونوں کے جذبات میں ایک طرح کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اقبال نے گوئٹے کی اس ذہنی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہان معنی آباد ہے، اسی طرح گوئٹے کے بے ساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں"۔ لہٰذا کہ سکتے ہیں کہ حافظ کا کلام جس طرح "مغربی دیوان" کا محرک بنا ویسے ہی گوئٹے کا "مغربی دیوان" اقبال کے "پیامِ مشرق" کی تخلیق کا باعث بنا۔ اقبال کا مجموعہ کلام "پیامِ مشرق" گوئٹے کے "مغربی دیوان" کے قریباً ایک سو سال بعد وجود میں آیا۔ علامہ اقبال سو سال کے پہلے جرمنی اور اپنے زمانے کے مشرق کے حالات میں ایک طرح کی مماثلت پاتے ہیں۔ اس دیوان سے اِس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بے زار ہو کر مشرق کی سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔(37)

علامہ نے پیامِ مشرق میں ایسے مذہبی، اخلاقی اور ملی حقائق پیش کیے ہیں جن کا مقصد افراد اور ملل کی باطنی تربیت ہے۔ وہ اقوام مغرب کو خبردار کرنا چاہتے ہیں کہ جب تک معنوی اور فکری طور پر زندگی میں انقلاب برپا نہ ہو، خارجی انقلاب کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس انقلاب کو شرمندہ حقیقت بنانے کی ذمہ داری خود اقوام اور افراد کے کندھوں پر ہے۔(38)

Copyright © 2024 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

"پیامِ مشرق" کو علامہ اقبال نے اپنے ہم عصر افغانستان کے فرمانروا امیر امان اللہ خان کے نام معنون کیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ امان اللہ خان کی شخصیت میں وہ روح ایمانی دیکھ رہے تھے جو مسلمانوں کے لیے آزادی اور سربلندی کی موجب بن سکے۔ اقبال اسے شاہانہ لباس میں درویشانہ زندگی بسر کرنے اور خود شناسی کی تلقین کرتے ہیں۔ جن مسلمانوں نے عظمت اور سربلندی حاصل کی انھوں نے امیری میں فقیری کی تھی اور یہ بھی یاد دلاتے ہیں کہ ملت کی زندگی نبی کریم ﷺ کے عشق کے دم سے ہے لہٰذا نبی ﷺ سے والہانہ محبت کی تلقین کرتے ہیں۔ بہر حال امیر امان اللہ خان ان کی توقعات پر پورا نہ اتر سکے۔

زبورِ عجم

اس کتاب میں اول زبورِ عجم ہے جو کہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں مختلف غزلیات اور قطعات ہیں۔ اس کے بعد دو مثنویاں ہیں۔ مثنوی بند گی نامہ کے اندر غلامی اور محکومیت کے خلاف ایک جہاد ہے۔ زبورِ عجم میں ایک حصے میں خدا سے خطاب ہے جبکہ دوسرے حصے میں تمام عالم اور بالخصوص مشرق کو خطاب کیا ہے۔

"زبورِ عجم" کی غزلیات میں سوز و ساز اور لذتِ غم کی کیفیت نے اس شاہکار کو خود اس کے خالق کی نظر میں کتنا عظیم بنا دیا ہے۔ اس کا اندازہ خود شاعر کے ایک اردو شعر سے ہوتا ہے:

اگر ہو ذوق تو فرصت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

حقیقت یہ ہے کہ "زبورِ عجم" فغان نیم شبی کی ایک مسلسل داستان ہے جس نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی گوناگوں کیفیتوں اور تقاضوں کو غزل کے رنگ میں اور جذبات کی زبان میں سمویا ہے۔ اس کتاب میں سوز و ساز کی ایک منفرد اور بے مثال کیفیت ہے۔ موسیقی کی جو فراوانی اور متنوع دلکشی اس مجموعے میں ہے، شاید کسی دوسری کتاب میں نہیں۔ اس کے جذب و مستی اور وفورِ شوق کی متلاطم کیفیت اس کے وجد آفرین نغموں میں چھلک رہی ہے۔ اس میں شاعر کی نالہ نیم شبی کا نیاز بھی ہے اور دل کی پوشیدہ بے تابیاں بھی ہیں۔ اس کی امنگیں اور آرزوئیں بھی ہیں اور جستجوئیں بھی۔ اس کے جذبات و افکار نغمہ و آہنگ کے طوفان میں ڈھل کے نکلے ہیں۔ یہاں عشق گرہ کشا کے فیض کا ترانہ بھی ہے اور عقل فسوں پیشہ کا فسانہ بھی۔ مگر تفکر و تامل کا اظہار جذبات کی زبان میں اس طرح ہوا ہے کہ سنگین حقائق پر تغزل کا گمان گزرتا ہے۔(39)

بر خیز کہ آدم راہنگام نمود آمد
این مشت غباری راانجم بہ سجود آمد
آن راز کہ پوشیدہ در سینہ ہستی بود
از شوخی آب و گل در گفت و شنود آمد(40)

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (1939ء)

یہ اقبال کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف موقعوں پر دیے تھے۔ اس کو اسلامی علمِ کلام کی تصنیف کہنا بے جا نہ ہوگا۔ خطبات کے موضوعات کچھ اس طرح ہیں:

1. علم اور روحانی حال و وجدان
2. مذہبی وجدان کی فلسفیانہ جانچ
3. تصورِ باری تعالیٰ اور دعا کا مفہوم
4. نفس انسانی، مسئلہ اختیار و بقا
5. اسلامی ثقافت کی روح
6. اسلام کی تعمیر میں اصول حرکت
7. روحانی وجدان کی حقیقت کا امکان

جاوید نامہ 1932ء

Copyright © 2024 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

علامہ کی اس مشہور مثنوی کا خاکہ 1927ء سے ان کے ذہن میں تھا۔ (ایک موقع پر دورانِ گفتگو انھوں نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا تھا) تاہم پہلی مرتبہ وہ 1932ء میں شائع ہوئی۔

اس مثنوی میں انہوں نے سیر افلاک کے ذریعے اپنا فلسفہ حیات، اپنے دور کے بعض اہم سیاسی اور اجتماعی مسائل اور تحریکات نیز اسلامی ملتوں کے حقائق و مسائل پر اپنا نقطہ نظر ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ تمثیلی و تخیلی انداز اختیار کرنے کے لیے انہیں بعض کتب کی تلاش تھی جن میں سیر افلاک کے ذریعے زندگی کے کسی خاص نقطہ نظر یا روحانی واخلاقی اقدار کا اظہار وابلاغ پیش نظر رہا ہو۔ اس سلسلے میں ان کے خطوط کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اس مثنوی میں قسم قسم کی علمی و فکری، دینی و سیاسی اور اجتماعی حقائق کے پیشِ نظر علامہ کو بجا طور پر اپنی اس مثنوی کی بے مثل حقیقت کا احساس تھا۔ چناچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"جہاں تک میرا علم ہے، کسی زبان میں اس قسم کی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی"۔

"حقیقت یہ ہے کہ اس میں حقیقت و تخیل کو جس انداز میں ہم آہنگ کیا گیا ہے اور اس میں افکار کے عمق، تخیل کی توانائی وفسوں کاری اور قوتِ بیانیہ کے سحر و اعجاز کے ساتھ ساتھ جراتِ اظہار کا جو انداز ملتا ہے، اس نے علامہ کے اس شاہکار کو یکتائے روزگار ادبی اور فکری تخلیق بنادیا ہے۔ علامہ کی آرزو تھی کہ اس کتاب کا بہ طریق احسن ترجمہ کیا جائے اور اگر ہو سکے تو اس کے مطالب کو متصور بھی کیا جائے۔ انہیں یقین تھا کہ یہ کوشش مترجم اور مصور کی شہرت کا باعث ہوگی۔"(41)

یہ کتاب اقبال کی بلندی فکر و فن کی معراج ہے۔ اس میں اقبال زندہ رود کے نام سے پیر رومی کی قیادت میں افلاک کی سیر کرتے ہیں آخر میں خطاب بہ جاوید کے عنوان سے جاوید کو اور در حقیقت تمام نوجوان نسل کو خطاب کیا ہے:

نوجوانان تشنہ لب، خالی ایاغ
شستہ رو، تاریک جان، روشن دماغ
کم نگاہ و بی یقین و ناامید
چشم شان اندر جہان چیزی ندید!(42)

خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں کہ جاوید نامہ ایک بحر بے کراں ہے۔ اس کی نسبت یہ توقع رکھنا کہ کوئی شخص چند لمحوں میں اس کا خلاصہ یا لب لباب بیان کر دے گا، کسی بھی مفکر یا مقرر کے بس کی بات نہیں۔ اس کتاب میں تخییل و تمثیل سے کام لے کر ایک سحر نگار مفکر اور فکر انگیز شاعر حکیم نے انسان کی دیرینہ روحانی کشاکش کو نہایت دل نشین انداز میں پیش کیا ہے۔(43)

بالِ جبریل 1935ء

علامہ کی یہ کتاب تعلیمات سے بھرپور ہے۔ راہنماؤں کی کج روی، خلوص و یقین کے فقدان اور طلسم مغرب کے فریب میں گرفتاری پر اقبال نے سخت سرزنش کی ہے اور عرفان خودی کا اور مومن بننے کا پیغام دیا ہے۔ عشق کی تعریف بڑے ہی دلنشین انداز میں بیان کی ہے:

عشق دم جبریل، عشق دل مصطفی ﷺ
عشق خدا کا رسول ﷺ عشق خدا کا کلام
عشق کے مضراب سے نغمہ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات (44)

بالِ جبریل میں اقبال کے مردِ کامل کا تصور اپنے کمال کو پہنچ چکا ہے فرماتے ہیں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندہِ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا و کارساز

خاکی و نوری نہاد، بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل

Copyright © 2024 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

اس کی ادا دل فریب، اس کی نگاہ دل نواز(45)

پس چہ باید کرد ای اقوام مشرق 1936ء

اس میں اول مثنوی ہے۔ اقبال پیر رومی کی زبان سے خوشخبری سناتے ہیں کہ خاور از خواب گران بیدار شد۔ پھر رومی اقبال کو نصیحت کرتے ہیں کہ تم معنی دین و سیاست پھر اہلِ مشرق کو سنادو۔ اس کتاب میں مثنوی مسافر بھی شامل ہے جو 1933ء میں لکھی گئی۔

ضرب کلیم 1936ء

ضرب کلیم کے 6 عنوانات ہیں:

1۔ اسلام اور مسلمان

2۔ تعلیم و تربیت

3۔ عورت

4۔ ادبیات، فنون لطیفہ

5۔ سیاستِ مشرق و مغرب

6۔ محراب گل افغان کے افکار

ارمغانِ حجاز 1938ء

علامہ اقبال کے مرض الموت میں زیر ترتیب تھی۔ نومبر 1938ء میں اشاعت کی نوبت آئی۔ ایک حصہ فارسی اور دوسرا اردو شاعری پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے آخر میں بھی اقبال نے اپنا خودی کا پیغام جو کہ پختگی کی آخری منزل پر پہنچ چکا ہے، بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے:

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقام حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ حیات
خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکران ترا
ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات
خودی ہے زندہ تو ماند کاہ پیشِ نسیم
خودی ہے زندہ تو سلطان جملہ موجودات(46)

اقبال کی فنکاری شروع سے ہی لطیف و نفیس رہی ہے۔ ایک طرف لطافت و نفاست اور دوسری طرف دقت و باریکی کا امتزاج بانگ درا کے مختلف حصوں سے شروع ہو کر بالِ جبریل میں اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ جس کے بعد لطافت و نفاست بڑھتے جاتے ہیں اور ضربِ کلیم میں اپنے شباب پر نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخری مجموعہ کلام ارمغانِ حجاز میں اس شباب کے چند اشعار اس طرح نگاہوں کے سامنے آتے ہیں کہ تمثیل کا وہ عنصر جو ابتداء سے اقبال کی شاعری میں کار فرما تھا، بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔(47)

سرودِ رفتہ باز آید کہ نہ آید؟
نسیمی از حجاز آید کہ نہ آید؟
سر آمد روزگار این فقیری؟
دگر دانای راز آید کہ نہ آید؟

حوالہ جات

Copyright © 2024 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

1. افتخار احمد، صدیقی، ڈاکٹر، عروج اقبال (لاہور: بزم اقبال، کلب روڈ 1987ء) ص 4۔
2. عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، فکرِ اقبال (لاہور: بزم اقبال، کلب روڈ 1983ء) ص 1۔
3. ایضاً، ص 23۔
4. ایضاً ، ص 9۔
5. افتخار احمد، صدیقی، ڈاکٹر، عروج اقبال ص 45-46۔
6. ایضاً ، ص 49۔
7. اقبال، کلیاتِ اقبال، اردو (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز) ص 72۔
8. عبدالحکیم، خلیفہ، فکرِ اقبال، ص 26۔
9. اقبال، کلیاتِ اقبال، اردو، ص 99۔
10. ایضاً ، ص 100۔
11. ایضاً ، ص 71۔
12. ایضاً ، ص 88۔
13. ایضاً ، ص 46۔
14. غلام حسین، ذوالفقار، ڈاکٹر، اقبال کا ذہنی اور فکری ارتقا (لاہور: بزم اقبال اکتوبر 1998ء) ص 15۔
15. اقبال، کلیاتِ اقبال، اردو، ص 141۔
16. عابد علی، عابد، سید، شعر اقبال (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، 2003ء) ص 111۔
17. اقبال، کلیاتِ اقبال، اردو، ص 113۔
18. ایضاً ، ص 130۔
19. افتخار احمد، صدیقی، عروج اقبال، ص 345، 346۔
20. عابد علی، عابد، سید، شعر اقبال، ص 236۔
21. اورینٹل کالج میگزین، جشنِ اقبال نمبر (لاہور: پنجاب یونیورسٹی پریس، 1977ء) ص 227۔
22. شاہد حسین، رزاقی (مرتبہ) مقالاتِ حکیم از خلیفہ عبدالحکیم، جلد دوم (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامی، کلب روڈ، 1969ء) ص 118۔
23. اقبال، کلیاتِ اقبال، اردو، ص 156۔
24. ایضاً ، ص 386۔
25. ایضاً ، ص 269۔
26. ایضاً ، ص 248۔
27. ایضاً ، ص 265۔
28. اقبال، خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ، 1930ء، مترجمہ نذیر احمد نیازی صاحب۔
29. اقبال، کلیاتِ اقبال، ص 261۔
30. ایضاً ، ص 274۔

Copyright © 2024 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

31. یوسف سلیم، چشتی، شرحِ اسرارِ خودی(لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، س ن)ص14،54۔
32. جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکارِ اقبال(لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز2005ء)ص14۔
33. اقبال، کلیاتِ اقبال، فارسی(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، 1981ء)ص12۔
34. عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ(لاہور: اقبال اکیڈمی، 2000ء)ص53۔
35. یوسف سلیم چشتی، شرحِ رموزِ بے خودی، ص24۔2۔
36. اقبال، کلیاتِ اقبال، فارسی، ص85۔
37. اقبال، دیباچہ پیامِ مشرق(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، 1981ء)ص177۔
38. عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص75۔
39. ایضاً، ص112،111۔
40. اقبال، کلیاتِ اقبال، فارسی، ص455۔
41. عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص24۔
42. اقبال، کلیاتِ اقبال، فارسی، ص791،790۔
43. شاہد حسین رزاقی (مرتبہ)مقالاتِ حکیم از خلیفہ عبدالحکیم، ص275۔
44. اقبال، کلیاتِ اقبال، اردو، ص387،386۔
45. ایضاً، ص389۔
46. ایضاً، ص667۔
47. عبدالغنی، ڈاکٹر، اقبال کا نظامِ فن(لاہور: اقبال اکیڈمی1990ء)ص457۔

Copyright © 2024 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)